اریب

پاسِ گریباں

سلیمان اریب

ناشر:- انجمن ترقی اردو حیدرآباد

اپریل ۱۹۶۱ء

پہلی بار .... ایک ہزار

قیمت ... دو روپے پچاس نئے پیسے

سرِورق اور اسکیچ ...... سعید بن محمد

کتابت .... محمد مظہر

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد
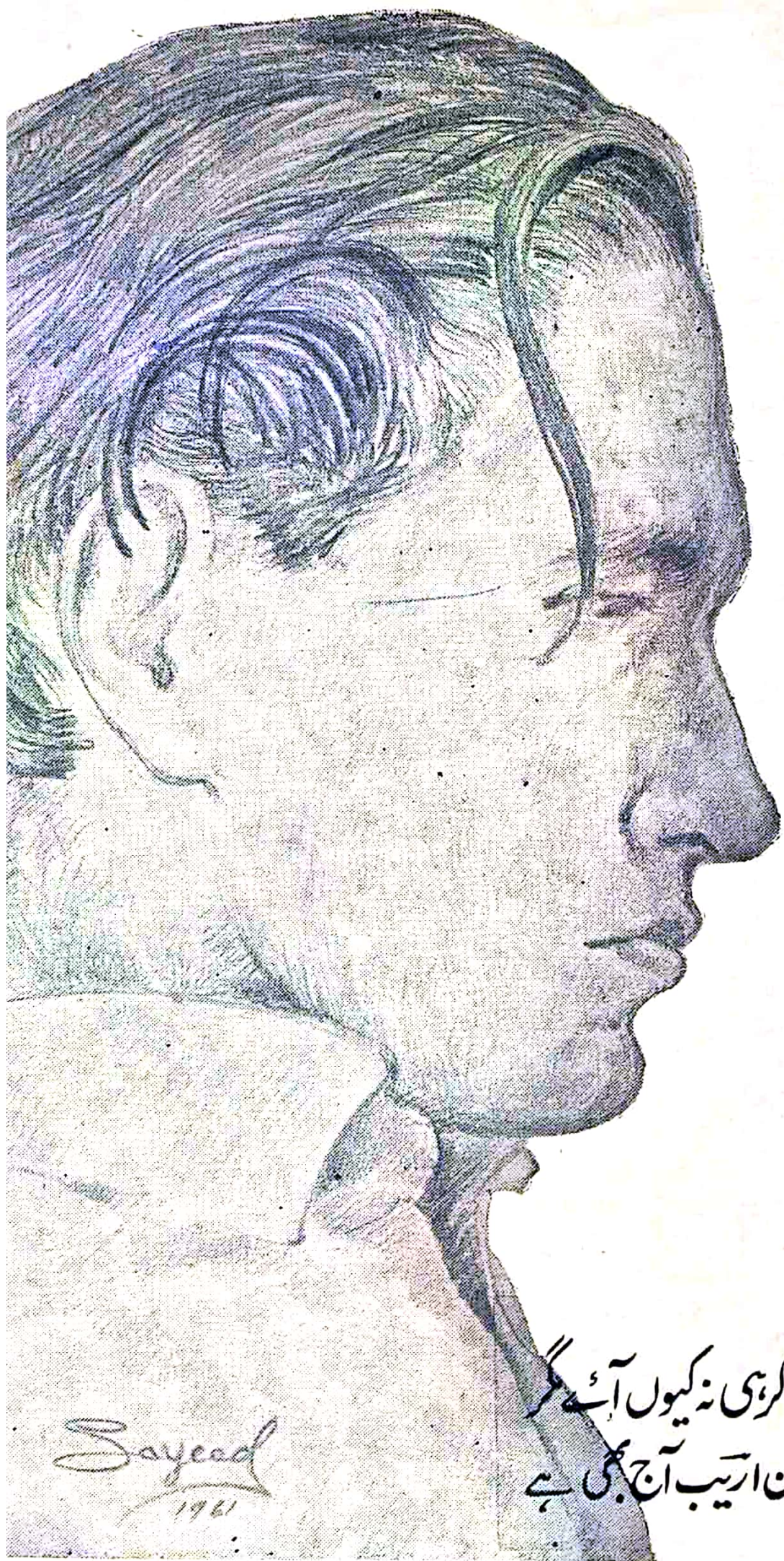
شکل واعظ کی بنا کر ہی نہ کیوں آئے گر
رندِ بد نام سلیمان اریب آج بھی ہے

صفیہ کے نام

کہا جو کچھ تو ترا "عشق" ہو گیا محدود

پاسِ گریباں کے بارے میں

مشہور شاعر سلیمان اریب کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب "پاسِ گریباں" شائع کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو مسرت محسوس کرتی ہے۔

اردو کے نوجوان شاعروں میں اریب کا جو مرتبہ ہے اس سے ہندوپاک کے ادبی حلقے اچھی طرح واقف ہیں اس لیے ان کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ "پاسِ گریباں" کی اشاعت کو آج کے شعری ادب میں ایک خوشگوار اضافہ سمجھا جائے گا۔

انجمن ترقی اردو (حیدرآباد) کوشاں ہے کہ حیدرآباد کے دوسرے شعراء و ادباء کی تخلیقات بھی شائع ہو کر اہلِ ذوق تک پہنچتی رہیں، پڑھنے والوں کی ہمت افزائی اس سلسلے کو یقیناً جاری رکھے گی۔

۱۳ر مارچ ۱۹۶۱ء

حبیب الرحمٰن
معتمد انجمن ترقی اردو (حیدرآباد)
اردو ہال۔ حمایت نگر

چند باتیں

میں اگرچہ ۱۹۴۲ء سے باقاعدہ شعر کہتا ہوں لیکن "پاسِ گریباں" میں جو تخلیقات شامل ہیں وہ ۱۹۴۴ء سے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے جو کچھ کہا تھا یا ۱۹۶۰ء تک جو کچھ کہا بالخصوص ۱۹۵۱ء تک جو نظمیں لکھیں ان کا ایک بڑا حصّہ میں نے خارج کر دیا ہے اس لیے کہ ان میں سے اکثر نظمیں مسائلی اور سیاسی ہیں اور آج کے ذہن و فکر کے لحاظ سے ان کی اشاعت مناسب نہ تھی۔ شاعری مقصدی ہو یا غیر مقصدی حکیمانہ ہو یا فلسفیانہ، مسائلی ہو یا اخلاقی، مذہبی ہو یا سیاسی اسے پہلے ادب ہونا چاہیئے اور میں نے جو نظمیں اور اشعار قلمزد کر دیئے ہیں وہ اسی بنا پر کہ ان میں نعرہ بازی زیادہ آگئی تھی اور ادب کا تناسب کم ہو گیا تھا۔ البتہ میں نے اس زمانے کی دو چار نظمیں رہنے دی ہیں اس لیے کہ وہ نظمیں میرے نزدیک محض پروپگنڈہ نہیں، دوسرے ان میں سے دو نظموں "مجاہد تلنگانہ" اور "انسان نہیں مر سکتا" سے مجھے جذباتی لگاؤ بھی ہے۔ "مجاہد تلنگانہ" سنانے کے جرم میں

مجھے حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے بعد کی ملٹری گورنمنٹ نے دو سال تک نظر بند رکھا تھا اور "انسان نہیں مرسکتا" شاید میری آخری نظم ہے جس کے بعد میں کوئی اور نظم نہ لکھ سکا۔

میں کیا کہا گیا ہے کے ساتھ کس طرح کہا گیا ہے کو بھی اہمیت دیتا ہوں اس لیے حتی الامکان زبان اور شاعری کی پابندیوں کو ملحوظ رکھتا ہوں لیکن اسی حد تک کہ شاعری کا خون نہ ہو۔

میں چاہتا تو یہ تھا کہ "پاسِ گریباں" کے دیباچے میں اپنے ذہنی ارتقا کو بتاتے ہوئے ایسے بہت سے ادبی مسائل کو زیرِ بحث لاؤں جن کا تعلق میری شاعری سے ہے اور پھر ان تجربات کا ذکر کروں جو ذاتی ہوتے ہوئے بھی سب کے ہو سکتے ہیں۔ اس سے واضح طور پر میرا نقطۂ نظر اور اندازِ فکر سب کے سامنے آسکتا تھا لیکن اب یہ اس لیے ممکن نہیں کہ میری افتادِ طبع کی بہانہ جوئی "پاسِ گریباں" کی اشاعت میں مزید تاخیر کا جواز نہیں بن سکتی لہٰذا ان مسائل پر بشرطِ فرصت و حیات پھر لکھوں گا۔

میں انجمن ترقی اردو (حیدرآباد) کا ممنون ہوں کہ انجمن نے میرا مجموعۂ کلام شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور مجھے خاص طور پر انجمن کے معتمد محترمی حبیب الرحمٰن صاحب کا اس لیے شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ موصوف مسلسل تقاضا نہ کرتے رہتے تو یہ مجموعہ ابھی نہ جانے کب تک شائع نہ ہوتا۔

میں اپنے احباب مغنی تبسم، سعید بن محمد اور محمد مظہر کا بھی شکر گزار ہوں۔ مغنی نے "پاس گریباں" کی اشاعت کے مختلف مرحلوں میں اپنے مفید مشوروں سے میری مدد کی۔ سعید نے دیر سے سہی لیکن بہرحال میری کتاب کا ایک خوبصورت سرورق اور اسکیچ بنایا، اور مظہر نے بہت خلوص کے ساتھ اس مجموعے کی کتابت کی۔ میرے لیے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے مالک احمد علی صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ طباعت پر خاص توجہ کر رہے ہیں۔

آج جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے والد کے انتقال کو صرف گیارہ دن ہوئے ہیں۔ مجھے بڑا دکھ ہے کہ میرا مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو میرے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر نہ معلوم کس قدر خوش ہوتے۔

سلیمان اریب
اے۔ سی گارڈز۔ حیدرآباد دکن

۱۱ر مارچ ۱۹۶۱ء

شاعر کے بارے میں

سلیمان اریب ۵ ر اپریل ۱۹۲۲ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے
یوں تو اریب نے طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ
باقاعدہ طور پر ۱۹۴۲ء سے شعر کہتے ہیں۔

ابتدا میں اریب افسانے، ڈرامے اور مضامین بھی لکھتے تھے لیکن بعد میں
انھوں نے نثر لکھنا ترک کر دیا۔

اریب ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے اور انھیں اپنی ایک انقلابی
نظم "مجاہد تلنگانہ" سنانے کے جرم میں حیدر آباد میں پولیس ایکشن کی بعد کی ملٹری گورنمنٹ
نے گرفتار کر لیا اور وہ دو برس جیل میں رہے۔ جیل سے رہا ہو کر آنے کے بعد
وہ پیس کمیٹی اور انجمن عوامی مصنفین کے سکریٹری منتخب ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں
طلبا کی ہڑتال کے سلسلے میں دوبارہ گرفتار ہوئے اور دو ماہ جیل میں رہے
اریب ۱۹۵۴ء میں کمیونسٹ پارٹی سے بے تعلق ہو گئے۔

اریب ۱۹۴۸ء میں ہفت روزہ "جمہور" کے ایڈیٹر تھے ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ
"چراغ" اور ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ "سب رس" کے ایڈیٹر رہے۔ آج کل ماہنامہ
"صبا" کے ایڈیٹر ہیں جسے وہ خود ۱۹۵۵ء سے نکال رہے ہیں۔

پیش کش

میں ترے حسن کی تعریف ہی کرتا رہتا
تیری تعریف کے الفاظ اگر مل سکتے
اُف ری بے مائگیٔ دامنِ گلزارِ زباں
ایک دو پھول ہی مطلب کے مگر مل سکتے

لالہ و گل ہوں کہ نرگس ہو کہ سرو و شمشاد
میں کسی سے بھی کوئی کام نہیں لے سکتا
تیرے رخسار و لب و چشم و قد و قامت کو
میں کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتا

جانے کب تک تجھے اللہ نے شاعر بن کر
شعرِ نازک کی طرح ذہن میں سوچا ہوگا
جب کہیں دہر کے دیوانِ مصوّر میں تجھے
گنگناتے ہوئے گاتے ہوئے لکھّا ہوگا

۱۹۴۴ء

تشبیب

اے کہ وابستہ ہے تجھ سے مرادامانِ سخن
تو کہ موضوعِ سخن، روحِ سخن، جانِ سخن
تیرے باعث اے گلِ نیلوفرِ باغِ جمال
رشکِ فردوس بریں میرا گلستانِ سخن

میری ہر نظم ترے پرتوِ رخ سے شاداب
فیضِ رفتار سے ہر گیت مرا تارِ رباب
چشمِ مخمور کی خیام نوازی کی قسم۔!
میرا ہر شعر چھلکتا ہوا اک جامِ شراب

جسم کے نور سے روشن نہ ہو کیوں میرا دماغ
جس کے آگے نہ جلا ماہِ دو ہفتہ کا چراغ
زلفِ شب تاب کی تشبیہہ جو سوچی ہے کبھی
مہر کو مل نہ سکا میرے تخیل کا سراغ

تیرے ہونٹوں سے ملا نطق کو میرے اعجاز
تیری باہوں سے ہے پیدا مری نظروں میں گداز
کیا کہوں کیا ہے تصوّر تری انگڑائی کا؟
عرش و کرسی سے پرے ہوتی ہے میری پرواز

کاش میں یوں ہی تراز کر کروں کرتا رہوں
پھول تو پھول ہیں افلاک سے تارے توڑوں
جب بھی فرصت ملے اک پل کی غمِ گیتی سے
تیری تصویر کے ہر خط میں یوں ہی رنگ بھروں

۱۹۴۴ء

قطعہ

گل بداماں نہ سہی چاک گریباں ہی سہی
نورِ ایماں نہ سہی ظلمتِ عصیاں ہی سہی
ہائے محرومیٔ جاوید کو یہ بھی تو نہیں
زندگی خواب سہی خوابِ پریشاں ہی سہی

۱۹۴۵ء

خونناب

(کسی کے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے پر)

حسن اور عشق کے پرکیف خیالوں میں مگن
جھومتا گاتا ہوا میں بھی تھا سرگرمِ سفر
کوئی پیکر ہو، کوئی زلف، کوئی آنچل ہو
چند لمحوں کے لیے تھے مرے مسجودِ نظر
ایک بے نام سی خواہش سے جو دل تھا بیتاب
ایک انجان سی تسکیں کو تڑپتا تھا جگر

اک دورا ہے یہ کچھ اس طرح ملیں تم مجھ سے!
جیسے تم مجھ سے کبھی تھیں ہی نہیں بیگانہ
تم نے پھر اپنی محبت کا الا پا دیپک!
اور مجھے بخش دیا سوزِ دلِ پروانہ!
میرے ساقی! تری بدمست نگاہوں کی قسم
میرے ہر گام پہ بنتا ہی رہا مے خانہ

ایک منزل ہی پہ دم لے کے چلے تھے آگے
اور ابھی دور بہت دور تھا ہم کو جانا
تم ہی تھیں اور نہ تمھارا تھا وہاں نقشِ قدم
میں نے اک موڑ پہ جو تم کو پلٹ کر دیکھا
تم نے سوچا نہیں کیا مجھ پہ گذر جائے گی
اور مجھے چھوڑ دیا زار و ملول و تنہا

تم کو جب ساتھ نہ دینا تھا مرا آخر تک
توڑنا تھا نہ تمھیں میری جوانی پہ ستم
خیراب ہوگی نہ دامن کو تمھارے زحمت
اب ہمیشہ ہی رہیں گی مری آنکھیں پُر نم
یاد کو اپنی بنا دو جو سہارا دل کا
حال پر ایک مسافر کے بڑا ہوگا کرم

۱۹۴۵ء

طرحِ نو

تیری الفت ہے میرے واسطے سرمایۂ ناز
ہاں مگر چھیڑ نئے طرز سے یہ کہنہ ساز!
تو بھی شیریں تو نہیں میں بھی تو فرہاد نہیں
کون مجنوں تھا بیاباں کو بھی اب یاد نہیں
حسن بھی وہ نہ رہا عشق بھی اب وہ نہ رہا
دل ہراک بار مری آنکھوں سے لہو بن کے بہا
اک حقیقت فقط اب حسن و محبت ہی نہیں
اب زمانے میں فقط ایک مصیبت ہی نہیں

کل بھی زیست پریشاں تھی مگر ایسی نہ تھی
پہلے بھی تنگیٔ داماں تھی مگر ایسی نہ تھی
کس نے دیکھی تھی کبھی درد کی ارزانی یہ
آنسوؤں، آہوں، کراہوں کی فراوانی یہ
بھوک، دریوزہ گری، جسم فروشی، ہے ہے
اف یہ فریاد ہیں بعنوانِ خموشی ہے ہے
کیا ہوا ایسی جو نہیں تو جو نہیں چاک جگر
ایک مخلوق یہاں دیکھ کہ ہے خاک بسر
کون سی تلخ حقیقت ہے بتا اے مری جاں
یہ غمِ عشق دو روزہ کہ غمِ دردِ جہاں
کیوں نہ ہم عشق کے مفہوم کو پھیلا دیں ذرا
اور غمِ دہر کی لذت کو بھی اپنا لیں ذرا

۱۹۴۵ء

پہلی کرن

ملکۂ شب کی سیہ تاب گھنیری زلفیں
چھا گئیں عارضِ گیتی پہ اندھیرا بن کر
مٹ گیا دن کا چمکتا ہوا ہر نقشِ جمیل
کالی ناگن بنی لیٹی ہے ہر اک راہ گذر

اب وہ ہلچل نہیں، ہنگامہ نہیں، زیست نہیں
غالب آتا چلا جاتا ہے گراں بارِ سکوت
وقفے وقفے سے مگر قلب کو برماتی ہے
کس کی فریاد ہے یہ جبرِ مسلسل کا ثبوت

کب تلک گردنِ جمہور جھکے گی آخر!
کب تلک ظلم کے چلتے ہی رہیں گے آرے
کب تلک آہوں کراہوں پہ ہنسیں گے آخر
آگ اور خون کے بپھرے ہوئے اندھے دھارے

لو اُٹھی شرق سے وہ پہلی کرن کی برچھی
چھد گیا سینۂ شب ظلمتیں روپوش ہوئیں
ان گنت زخم نصیبوں کی سسکتی روحیں
عدل و انصاف کی حوروں سے ہم آغوش ہوئیں

۱۹۴۵ء

آغاز و انجام

خون کی سرخیٔ پائندہ سے تابندہ ہے
ابنِ آدم کا تو قصّہ ہی عجب قصّہ ہے
جو ہے آغاز وہ انجام نظر آتا ہے!
قتل و غارت گری کیا اپنا فقط حصّہ ہے

آج تک پا نہ سکے رازِ سکوں کی راہیں
صدیوں سر جوڑ کے بیٹھے رہے عقل و عرفاں
ہاتھ تھک تھک گئے چھید چھید گئے غمخواری کے
آج بھی دل کے مگر چاک ہیں جیب و داماں

مفلسی، فحبگی، دریوزہ گری، قارونی
پشتِ گیتی میں ابھی اور ہیں ناسور کئی
چھین لی کس نے وہ تاثیر دمِ عیسیٰ کی
رستے رہتے ہیں ابھی دیدۂ بے نور کئی

جس طرف بھی مرے اللہ نظر کرتا ہوں
"تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے"
جانے کیا بات ہے کیوں زلفِ چلیپا کی طرح
زندگی ہے کہ الجھتی ہی چلی جاتی ہے

۱۹۴۵ء

ملے فیض احمد فیض

غزلِ مسلسل

"آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں"[1]
پھر گل و گلزار کی باتیں کریں
پیکرِ دلدار کی باتیں کریں
یعنی نور و نار کی باتیں کریں
دل کے کانٹوں کو بنائیں گلستاں
اُس لب و رخسار کی باتیں کریں
منہ لگائیں پھر مہ و مہتاب کو
عارض و رخسار کی باتیں کریں

[1] نہیں معلوم یہ مصرع کس کا ہے۔ اریب

زخمِ دل کو اک ذرا پھر چھیڑ دیں
ابروئے خم دار کی باتیں کریں
عطرِ پیراہن کریں ہر سانس کو
زلفِ عنبر بار کی باتیں کریں
بے پیے ہی جھوم جائیں ایک بار
دیدۂ سرشار کی باتیں کریں
حافظ و غالب ہوں یا جوش و اریب
ہاں کسی میخوار کی باتیں کریں

۱۹۴۶ء

میری رہگذر میں

کتنی نظروں کا تکلم، کتنی آنکھوں کا پیام
جنبشِ ابرو کے کتنے دلکش و نازک سلام
کتنے گل افشاں تبسّم، کتنے ہونٹوں کا فسوں
چوڑیوں کے زمزموں میں کتنی باہوں کا سکوں
کتنی زلفوں کی مہک، کتنی جبینوں کی دمک
کتنے پائل کی چھما چھم، کتنے جاموں کی کھنک
کتنے سانسوں کی تپش، کتنے ہی سینوں کے چمن
کتنے ہی نوخاستہ نورس شگوفوں کی چٹکنا

کتنے ٹھنڈے دامنوں کی مہکی مہکی سی ہوا
کتنے رنگیں آنچلوں کی دُھنکی دُھنکی سی گھٹا
جلوہ پیرائی سے کتنی جگمگاتی کھڑکیاں
چلمنوں کے پیچھے کتنی ہی مچلتی بجلیاں
کتنے سیمیں پیکروں، زرّیں رخوں کا التفات
کتنے مہر و ماہ سے نکھرے ہوئے دن اور رات
بازوؤں کے کتنے ساحل، کتنے جسموں کے بھنور
کشتئ دل کو مری کرتے ہوئے زیر و زبر
میرے رستے میں بنا دیتے ہیں ہر ذرّے کو طور
میں مگر آگاہ ہوں، منزل ہے میری کتنی دور

۶۱۹۴۶

برسات

بادل کا آنچل لہراتی   بجلی کے کنگن چمکاتی
دامن کی نمناک ہوا سے   دل کو آتش زار بناتی
آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

"نیل کنول" نے لی انگڑائی   کلیوں نے گویائی پائی
دور کہیں مستانہ لے میں   چرواہے نے تان اڑائی
آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

ویرانوں میں آئی بہاریں　　جنگل جنگل مور پکاریں
دھرتی کے پیاسے ہونٹوں پر　　امرت کی پڑتی ہیں پھواریں
آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

کھیتوں پر آیا ہے جوبن　　ہر وادی مالن کا دامن
رنگ و بو کی ارزانی سے　　جنت در جنت ہر گلشن
آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

میخواری پھر عام ہوی ہے　　توبہ غرقِ جام ہوی ہے
آؤ چلیں میخانہ جائیں　　وقت سے پہلے شام ہوی ہے
آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

۱۹۴۶ء

اے سروِ رواں اے جانِ جہاں آہستہ گزر آہستہ گزر
جی بھر کے میں تجھ کو دیکھ تو لوں بس اتنا ٹھہر بس اتنا ٹھہر

کچھ لوگ ابھی تک ایسے ہیں جو تابِ نظارہ رکھتے ہیں
اے حسنِ دل آرا اور نکھر اے کاکلِ پُرخم اور سنور

وہ ماہ نہیں خورشید نہیں کہنے کو اک انساں ہے پھر بھی
تاریک نظر آتا ہے جہاں ہٹتی ہے جب اُس کے رخ سے نظر

پہلے تو یہ اپنا حال نہ تھا بے چین نہ تھے بے تاب نہ تھے
کیا عشق میں یوں ہی ہوتا ہے اک آگ سی ہے دل تا بہ جگر

یہ کانٹے کیا یہ چھالے کیا خود پھول کھلیں گے راہوں میں
اے اہلِ طلب ہے شرط سفر اٹھو تو سہی باندھو تو کمر

۱۹۴۷ء

دکن کی سانولی

کون وہ محوِ خرامِ ناز ہے اے ہم نشیں
دیکھ لیلیٰ تو نہیں ہے، دیکھ رادھا تو نہیں؟

بنتِ زُہرہ ہے، نہ جانے دخترِ مہتاب ہے
فیصلہ ہو کس طرح کب دیکھنے کی تاب ہے؟

سانولی رنگت میں بھی یہ شانِ حسنِ تازہ کار
جس پہ صُبحوں کے اُجالے جس پہ صُبحیں بھی نثار

میں تو بس اتنا سمجھتا ہوں کہ وہ کوئی بھی ہو
دستِ فطرت نے مجسم کر دیا ہے شام کو

۱۹۴۷ء

لمحۂ گزراں

میری محبوب یہ اک لمحہ یہ اک لمحۂ قرب
کاش ہوتی تجھے اس لمحے کی قیمت معلوم
اپنا سرمایہ یہی ہے یہی دولت اپنی
شبنم آسا جو ابھی ہے ابھی ہو گا معدوم

میں قنوطی نہیں پھر بھی نہیں کل پر ایماں
جانے کل کیا ہو بھلا کون بتا سکتا ہے؟
جانے کل ہم تو رہیں ہم میں محبت نہ رہے
کون پھر ہم میں سے اس لمحے کو پا سکتا ہے

اِس سے پہلے کہ گزر جائے نہ یہ لمحہ کہیں
آ کہ ہم پیار کریں زیست کو کرلیں رنگیں

۱۹۳۷ء

اے جانِ نغمگی ہے کیوں رنگِ رخ پریدہ
اب میرے پاس ہے کیا اک آہِ ناکشیدہ

گر تو برا نہ مانے اک بات تجھ سے پوچھوں
احساسِ عشق مجھ میں ہے کس کا آفریدہ

کنگن یہ کس کے کھنکے، پائل یہ کس کی چھنکی
یہ زمزمے، یہ نغمے جیسے ہیں کچھ شنیدہ

پھر میری وحشتوں کے چرچے ہیں دلبروں میں
پھر ملتفت ہے مجھ سے اک آہوئے رمیدہ

دامن کچھ آن کا اتنا کوتاہ بھی نہ ہوگا
کیا تجھ کو ہوگیا تھا اے دستِ نارسیدہ

تیرے لبوں کا امرت سب چاہتے ہیں لیکن
محفل میں تیری کتنے ہیں زہرِ غم چشیدہ

اے سیلِ نور و نکہت اے زندگی سلامت!
ہنستے رہیں ہمیشہ گلہائے نو دمیدہ

جانِ اریب تیری کیا آرزو کروں میں
تو بھی ہے زر گزیدہ میں بھی ہوں زر گزیدہ

۱۹۴۷ء

مریں بھی تو کیا جب جیا جائے نا[1]
کہ اب زہر بھی تو پیا جائے نا

وہ حُسن مجسم ہے اے دوستو
اُسے نام قاتل دیا جائے نا

بیابان و تیشہ سے مجھ کو غرض؟
محبت کو رسوا کیا جائے نا

جنوں آشنا جس نے مجھ کو کیا
اُسی سے گریباں سیا جائے نا

[1] نذر محمد قلی قطب شاہ

اک اشکِ چکیدہ مری کائنات
یہ تحفہ بھی اس کو دیا جائے نا

کسی کی عنایت نہ پوچھو اریبؔ
زمانے کا شکوہ کیا جائے نا

۱۹۴۷ء

مسلماں جن کے چہرے

مسلماں جن کے چہرے، جن کے دل زندیق و کافر ہیں
بظاہر بُت شکن لیکن حقیقت میں جو بُت گر ہیں
ضمیروں کی خباثت جن کی آنکھوں سے جھلکتی ہے
گناہوں کی سیاہی جن کی صبحوں سے ٹپکتی ہے
دلوں کا کوڑھ جو سنجاب و دیبا میں چھپاتے ہیں
جو خوشبوؤں سے ذہنوں کی عفونت کو دباتے ہیں
جو مریم زادیوں کو بھیجتے رہتے ہیں کوٹھوں پر
جو لعنت بھیجتے ہیں فحبگی پر برسرِ منبر

جو پھولوں کے بھی تاجر ہیں جو کانٹوں کے بھی تاجر ہیں
دکانِ مذہب و ملت سجانے میں جو ماہر ہیں
سلاتے ہیں جو میٹھی نیند دے کر درسِ بیداری
کئی پشتوں سے پیشہ جن کا مکّاری، ریاکاری
ہنسی میں جن کی، اک عالم کے آنسو کھِل کھلاتے ہیں
لبوں سے چھین کر جو دوسروں کے گیت گاتے ہیں
گدازِ عشق جن کے دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
جنوں جن کا سرِ بازار رسوا ہو نہیں سکتا
غمِ جاناں غمِ دوراں جو کوئی غم نہیں رکھتے
جو رکھتے ہیں تو دامن دیدۂ پُر نم نہیں رکھتے
پنپ جانے کی پھر اک بار جن کو آس اب بھی ہے
وصیّت جعفر و صادق کی جن کے پاس اب بھی ہے
جو طوقِ زر کے بدلے حرّیت کو بیچ دیتے ہیں
خودی کو روح کو انسانیت کو بیچ دیتے ہیں

وہ میری بادہ خواری کو بُرا کہتے ہیں حیرت ہے
لطافت پر کثافت مسکرائے کیا قیامت ہے
اندھیرے نور کے قالب میں ڈھل جاتے تو اچھّا تھا
وہ میری لغزشِ پا سے سنبھل جاتے تو اچھّا تھا

۱۹۴۷ء

رباعیات

کونین سے بیگانہ بنا دے ساقی
ہر پھول کو پیمانہ بنا دے ساقی
میخانے سے باہر نہیں جانا ہے مجھے
دنیا ہی کو میخانہ بنا دے ساقی

⁂

غم اُس کی جدائی کا ستاتا ہے مجھے
ماضی کے دھندلکوں میں بُلاتا ہے مجھے
احساس نے بدلی نہ ہو کروٹ ساقی
بھر جام کے پھر ہوش سا آتا ہے مجھے

ہر مرحلۂ دہر کو آساں کر لوں
مرنے کے لیے جینے کے ساماں کر لوں
چلتا ہوں مگر چلنے سے پہلے اے موت
پیمانے کے ہر خط کو رگِ جاں کر لوں

❖

پھر حافظؔ و غالبؔ کو جوانی دے دوں
خیامؔ کو پھر قالبِ ثانی دے دوں
اک پل کے لیے میں جو خدا ہو جاؤں
دنیا کو بس انگور کا پانی دے دوں

۱۹۴۷ء

مرگِ انسانیت

(فسادات پر)

سازِ کیسے وہاں میں اٹھاؤں

زندگانی جہاں نوحہ خواں ہے

کیسے گل اور کہاں کا نشیمن

ایک آتشکدہ گلستاں ہے

چشمِ بینا بھی دھندلا گئی ہے

راستوں پر یہ کیسا دھواں ہے

کس کی آنکھیں تھیں وقفِ تبسّم

کس کی آنکھوں سے دریا رواں ہے

موت لاشوں پہ ہے رقص فرما
اُف یہ کیسا بھیانک سماں ہے
جا کے منزل پہ پلٹا ہے راہی
کیا نہیں یہ مقامِ فغاں ہے
کوئی ہندو ہے کوئی مسلماں
کس سے پوچھوں میں انساں کہاں ہے

۱۹۴۸ء

قطعہ

رات کے ڈوبتے تاروں نے یہ بتلایا مجھے
رات کتنی ہی بڑی رات ہو ٹل جاتی ہے
گر کوئی چاہے تو زنجیرِ درازِ ظلمت
نورِ خورشید کی شمشیر میں ڈھل جاتی ہے

۱۹۴۸ء

صبح ہوتی ہے

حریفِ شعلہ بیانی ہے پھر شرارِ لہب
فروغ پا بھی سکے گا دروغ بولہبی
حقیقتوں کے مقابل ہے سیمیا کی نمود
سہام و تیغ سے نالاں ہیں پھر سرورِ وسرور
تغیرات کی زد پر ہے پھر جمودِ اجل
کدالیں ایک طرف اک طرف بنائے محل
یقیں پرستوں سے اوہام پھر الجھتے ہیں
خلیل زادوں سے اصنام پھر الجھتے ہیں

ابھرتی موج کو پھر روکتے ہیں کچھ تنکے
مچلتی برق کو پھر ٹوکتے ہیں کچھ تنکے
ہوائے تند کو پھر کون یہ جکڑتا ہے
شعاعِ نور کو ناداں کیوں پکڑتا ہے
قلندری سے گدائی کو پھر شکایت ہے
فرازِ کوہ سے رائی کو پھر شکایت ہے
ضمیرِ پاک سے برہم ہے پھر بطونِ سیاہ
ہوس کا عشق سے کب ہو سکا جہاں میں نباہ
ہنر کے سامنے آتا ہے پھر فریبِ ہنر
طلوعِ مہر ادھر ہے ادھر ہے نجمِ سحر
یہ کس کی جیت ہے وہ دیکھ صبح ہوتی ہے
اگرچہ رات مسلسل سیاہی بوتی ہے

۱۹۴۸ء

مجاہدِ تلنگانہ

نئی بہار کی یہ کون دے رہا ہے نوید
جلو میں کس کے چلا آرہا ہے دورِ سعید
ہیں ہمرکاب یہ کس نور کے مہ و خورشید
محاذِ زیست پہ یہ کون ہو رہا ہے شہید
سلام تجھ پہ اے فرزندِ انقلاب سلام
نقیبِ امن اے دلبندِ انقلاب سلام

تری کدال سے لرزاں ہے خواجگی کی اساس
ترے خیال سے ظلِ الٰہ کے گم ہیں حواس
ترے خیال سے طاری رخِ شہی پہ ہراس
ترے جمالِ سحر سے شبِ دراز اداس
مجاہدانہ یوں ہی بڑھ کے پھونک دے ایواں
کہ میر و خان سے انسان مانگتا ہے اماں

بہار میں بھی چمن سوگوار تھا نہ رہا
کلی کلی کو ترا انتظار تھا نہ رہا
قرار بن کے فریبِ قرار تھا نہ رہا
بشکلِ مستی و نشہ خمار تھا نہ رہا
جھپٹ کے چہرۂ مکروہ سے نقابِ حسیں
بتا دیا ہے یہ تو نے کہ زہر شہد نہیں

یہ لہلہاتی ہوی کھیتیاں یہ دشت یہ بن
یہ مرغزار یہ رمنے یہ گل فروش چمن
یہ کانِ سیم بداماں یہ زر بکف معدن
یہ ارضِ حسن یہ چاول کی سرزمیں یہ دکن
زمانہ کل ہی بتادے گا سب یہ تیرا ہے
اگرچہ آج بھی رستوں پہ کچھ اندھیرا ہے

۱۹۴۸ء

امینِ رحمتِ یزداں

سیاہ رات کے تابوت کو اٹھائے ہوئے
نظر نظر میں سحر کے کنول جلائے ہوئے
بطونِ خاک میں بوتے ہوئے مہ و انجم
جبیں کے نور سے گیتی کو جگمگائے ہوئے
بکھیرتے ہوئے مہرِ منیر کی کرنیں — !
ہر ایک ذرہ کو آئینہ رو بنائے ہوئے
گلال[1] و رنگ اڑاتے اداس راہوں میں
بہار بن کے چمن در چمن کھلائے ہوئے

[1] یہاں میں نے "اور" کی جگہ "و" رہنے دیا ہے اس لیے کہ کانوں کو برا نہیں لگتا۔
اریب

لبِ خموش کو پھر اذنِ زمزمہ دیتے
ہنسا کے زخم نصیبوں کو مسکرائے ہوئے
رگوں میں خون کی گردش کو تیز تر کرتے
حیات بخش ترانوں کی لے بڑھائے ہوئے
مٹا کے فرقِ نشیب و فراز بے معنیٰ
بنائے کوشکِ گردوں نشاں ہلائے ہوئے
جو روکنا کوئی چاہے تو روک سکتا ہے
چلے ہیں قوتِ بازو کو آزمائے ہوئے
بصد جمالِ خلوص و بصد جلالِ جنوں
زمیں پہ چھائے ہوئے آسماں پہ چھائے ہوئے
امین رحمتِ یزداں ہیں آج کون وہی
کلاہ و تخت و زر و سیم کے ستائے ہوئے

(سنٹرل جیل حیدرآباد) ۱۹۴۸ء

زمیں کا درد

اگرچہ شام ہے برسات ہے گھٹائیں ہیں
خرد شکار، جنوں آزما فضائیں ہیں
نگارِ دہر کا انداز کافرانہ ہے
ہر ایک موجِ ہوا دل پہ تازیانہ ہے
یہ وقت ہے کہ جوانی کو شادماں کرلیں
نگاہِ ناز کو کچھ اور حرزِ جاں کرلیں
نہ پینا جرم سہی پھر بھی تو شراب نہ دے
مرے ندیم! مرے ہاتھ میں رباب نہ دے

میں جانتا ہوں کہ یہ لطف پائدار نہیں
زیادہ ایک تبسّم سے یہ بہار نہیں
پھر اس کے بعد وہی ہولناک کالی رات
وہی جہان، وہی کارزارِ مرگ و حیات
وہی لبسورتے چہرے، وہی غمِ ایام
وہی گھناونے منظر، وہی کریہہ جذام
وہی حرم کے اندھیرے ہوس کی بیدادیں
وہی کنوارے لبوں کی خموش فریادیں
وہی فلاکتِ رسوا کی چاک دامانی
وہی غریبی و ہی بام و در کی ویرانی
وہی خدائے زر و سیم کی غلط تقسیم
کسی کو صرف عفونت کسی کو صرف شمیم

تری نظر جو ادھر ایک بار اٹھ جائے
تجھے لہو کا مزہ پھر شراب میں آئے
تو اٹھ کے بزم کی ہر شے جلا نہ دے تو سہی
زمیں کے درد کو دل سے لگا نہ لے تو سہی

(سنٹرل جیل حیدرآباد) ۱۹۴۸ء

نیا پرچم

نہ جانے کب سے تیرا حسن ہے بازار کی رونق
تو سب کی ماں سہی اب بھی ترا نیلام ہوتا ہے
تجھے کس نے گرایا آسمانوں کی بلندی سے
جو میں کہتا ہوں کچھ تو سر دہی بدنام ہوتا ہے

میرے اجداد جن کی عظمتوں کی تو بھی قائل ہے
دیا کب تیری بیداری کو اذنِ بال جنبانی
کبھی گر اپنا اصلی روپ تو نے دیکھنا چاہا
تو آئینہ تجھے دے کر بڑھا دی تیری حیرانی

ترے فکر و عمل کی قوتوں کو ہر طرح روکا
کیا خوش تجھ کو تیرے حُسن کی تعریف کر کر کے
خیال و خواب کی دنیا میں تو کھوئی گئی آخر
تجھے بُت ہی بنا ڈالا تری الفت کا دم بھر کے

تجھے الجھائے رکھا سیم و زر کے نرم تاروں میں
کبھی غازے سے بہلایا کبھی جھومر سے بہلایا
بغاوت تو بغاوت کی جو تو نے لب کشائی بھی
تو رکھا تجھ کو پردے میں تجھے بے شرم ٹھہرایا

تجھے لوٹا اندھیروں میں تجھے لوٹا اجالوں میں
تجھے عریاں کیا محلوں میں بازاروں میں راہوں میں
ترا نغمہ نہ تھا پھر کوئی کیوں سنتا کشش پاتا
تری فریاد لرزاں میں تری چیخوں میں آہوں میں

تری دنیا ہی دوزخ تھی، تری وہ زندگانی تھی
اگرچہ تو سمجھتی تھی کہ ہے پیروں تلے جنّت
مگر اُس دورِ عورت کش پہ ہے اب نزع کا عالم
کہ جس میں ہو کے تو مریم بچا سکتی نہ تھی عصمت

حجابوں سے نکل آ اور میری ہم قدم ہو جا
کہ تیرے ساتھ مل کر اک نئی دنیا بسانا ہے
ٹپکتا ہے پُرانے پرچموں سے خونِ انساں کا
ترے گلنار آنچل سے نیا پرچم بنانا ہے

۱۹۴۹ء (سنٹرل جیل حیدر آباد)

چاندنی رات اور جھیل

دودھ کی سی ہے چاندنی چھٹکی
یاسمن زار بن گیا ہے جہاں
ہے سرِ چرخ مطربِ مہتاب
بر لبِ خامشی پہ نغمہ کناں

کھوئے کھوئے ہوئے سے دم سادھے
بام و در نور میں نہاتے ہیں
گود میں اپنی دھرتی ماتا کے
خاک کے ذرّے مسکراتے ہیں

کتنا گمبھیر ہے یہ سناٹا
سحر بستہ ہو جیسے ہر اک شے
دل کو محسوس ہوتا ہے ایسا
جیسے سستا رہی ہو زیست کی لے

اک دریچے میں ہوں اداس کھڑا
آنکھ سنگین کی ہے ٹوکے ہوئے
کس طرح چاندنی میں رقص کروں
سنگ و آہن ہیں مجھ کو روکے ہوئے

دوست لیکن ہم انقلابی جواں
یوں ہی محبوس رہ نہیں سکتے
ہم نے لے لی ہے ہاتھ میں شمشیر
اور ہم ظلم سہہ نہیں سکتے

وہ زمانہ قریب ہے جب ہم
زیست کو انگبیں بنائیں گے
حسن و الفت کے جوگ اور بہاگ
چاند کے ساتھ ہم بھی گائیں گے

(ڈسٹرکٹ جیل بٹیر) ۱۹۵۰ء

انسان نہیں مر سکتا

اس سے پہلے بھی کئی بار یہ موڑ آئے ہیں
تیری پائل کا ترنم
تیرے کنگن کی مچلتی ہوئی آواز کا لوچ
میرے اشعار، مرے گیت، مرے راگ، مرے جوگ بہاگ
بر ربط ماہ پہ گائے ہوئے میرے نغمے
ایک غمناک سی جھنکار میں تبدیل ہوئے
نالہ و نوحہ و فریاد میں تحلیل ہوئے

اس سے پہلے بھی کئی بار یہ موڑ آئے ہیں
دست میخوار سے چھینے گئے مینا و ایاغ

ہر خوشی چھینی گئی
عصمتیں، عفتیں، نیلام پہ اٹھوائی گئیں
کھیتیاں لوٹی گئیں، اجرتیں ہتیائی گئیں
قصرِ شدّاد سے ٹھکرائے گئے
کتنے اہرام بنے
لوٹ کی بھوک نے ہٹلر جنے، جنگیں جنیں، ویرانے جنے
زندگی درد سے معمور ہوئی، چور ہوئی؛ ایک رستا ہوا ناسور ہوئی

اس سے پہلے بھی کئی بار یہ موڑ آئے ہیں
نان و پوشش کے لیے، گھر کے لیے، گھر کے چراغوں کے لیے
جھومروں، چوڑیوں، سیندور بھری مانگوں، سہاگوں کے لیے
گلعذاروں کے تبسّم کے لیے
نکہتِ کاکلِ پُرخم کے لیے
حسن و الفت کے لیے

لالہ زاروں کے لیے، باغوں بہاروں کے لیے
امن و آزادی و خوشحالی و تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لیے
جب بھی ہم لوگ اٹھے
جب بھی محکوم کمربستہ و صف آرا ہوئے
خیر مقدم کے لیے، بیڑیاں آگے آئیں
طوق و زنجیر بڑھے
اور زندانوں کے در کھلنے لگے
رسیاں پھانسی کی لہرانے لگیں

چشم تاریخ نے ہر بار مگر دیکھا ہے
میرے جمہور کبھی دب نہ سکے، جُھک نہ سکے
اور سرافراز رہے
میرا انسان کبھی مر نہ سکا، مٹ نہ سکا
اور انسان نہیں مر سکتا

۱۹۵۱ء

سوزش و نور و تپ و تاب کا دیوانہ ہوں
میں نہیں جانتا کس شمع کا پروانہ ہوں

باعثِ حسنِ توجہ ہوں ابھی لوگوں کا
تو سلامت ترے الطاف کا افسانہ ہوں

ماہ و مہتاب سے نسبت ہے مگر اب اتنی
محفلِ ناز میں ٹوٹا ہوا پیمانہ ہوں

تیرے دامن میں گلستاں ترے آنچل میں بہار
اور میں آج بھی ہم قسمتِ ویرانہ ہوں

آہی جاتی ہے مگر یادِ مے و میخانہ
ترکِ مے کر کے بھی وابستۂ میخانہ ہوں

ایک مقصد ہے مرے شعر سے فن کا ارِیب
زلفِ ژولیدۂ گیتی کے لیے شانہ ہوں

۱۹۵۱ء

ہمیں دامن سے کیا مطلب کہ چشمِ نم نہیں ہیں ہم
وہ درماں ہوں تو ہوں لیکن، دلِ پُر غم نہیں ہیں ہم

نہیں وہ عشق کی قدریں وگرنہ دیکھتی دُنیا
کسی مجنوں، کسی فرہاد سے کچھ کم نہیں ہیں ہم

نہ وہ دل ہے، نہ دل میں ہے حرارت شوق کی باقی
نہ دیکھو پیار کی نظروں سے اب وہ ہم نہیں ہیں ہم

ہماری بزم میں تشنہ لبی اک جُرم ہے ساقی
کہ ہم سب جام رکھتے ہیں اگرچہ جم نہیں ہیں ہم

ابھی تک سلسلہ جاری ہے اپنی آزمائش کا
کلاہِ کج تو ہیں لیکن جبینِ خم نہیں ہیں ہم

ہمارے ساز کے ہر زیر و بم سے پھول کھلتے ہیں
کہ گلبانگِ مسرت ہیں نوائے غم نہیں ہیں ہم

۱۹۵۱ء

آگ سی ہے سینے میں اور آنکھ تر بھی ہے
ہے اِدھر جو حال اپنا کیا مگر اُدھر بھی ہے

کتنے دل تڑپتے ہیں کتنے دل مچلتے ہیں
اے نگاہِ بے پروا کچھ تجھے خبر بھی ہے

دھوپ اُس کا اک رخ ہے چاندنی ہے اک پہلو
وہ نگارِ سیمیں تن، شمس بھی قمر بھی ہے

جیسے پی رہا ہوں میں ماہتاب کی کرنیں
میرے جام میں ساقی کیا تری نظر بھی ہے

مجھ کو یہ بتایا ہے، ڈوبتے ستاروں نے
تلخ کامئ شب میں لذتِ سحر بھی ہے

تھک کے بیٹھ جائے یا لے کے دم چلے آگے
راہ میں مسافر کے سایۂ شجر بھی ہے

دوسروں کا دردو غم اک ذرا وہ اپنا لے
یوں ادیبؔ کے بس میں شعر بھی ہنر بھی ہے

۱۹۵۱ء

پرسشِ حال وہ اس طرح سے فرماتے ہیں
مسکرانے پہ بھی کچھ اشک جھلک آتے ہیں

عشق ہیں اور نہ جانے ابھی کیا ہونا ہے
اب تو بس دل میں کہیں ایک خلش پاتے ہیں

جیسے اک لمحہ کو رک جاتی ہے نبضِ عالم
جب میرے پاس سے وہ ہو کے نکل جاتے ہیں

خالی خالی نظر آتا ہے یہ آباد جہاں
جب تری بزم سے ہم اٹھ کے چلے آتے ہیں

چھڑ نہ جائے کہیں پھر قصۂ کفر و ایماں
سو ترا نام بھی لیتے ہوے گھبراتے ہیں

پہلے رو لیتے تھے جب دل کبھی بھر آتا تھا
اور اب آنکھ میں آنسو ہی نہیں آتے ہیں

لاؤ ٹوٹا ہوا پیمانہ کہاں ہے میرا
ابرِ آوارہ سرِ میکدہ منڈلاتے ہیں

وقت آئے تو اٹھا لیتے ہیں تلوار بھی ہم
اب ترے سایۂ گیسو میں غزل گاتے ہیں

(ڈسٹرکٹ جیل سکندر آباد) ۱۹۵۲ء

ہاں یہی کفر اصلِ ایماں ہے
میرا معبود آج انساں ہے

تجھ سے ملنے کو دل تڑپتا تھا
تجھ سے مل کر بھی دل پریشاں ہے

پھر کہاں اس میں لذتِ نایافت
تیرا ملنا تو خیر آساں ہے

ہے یہ کیسی بہارِ آزادی
ہر کلی چپ ہے پھول حیراں ہے

یہ زمانہ بھی خوب ہے ساقی
مے تو مہنگی ہے خون ارزاں ہے

گو کئی بار رندھ گئے ہیں گلے
آدمی آج بھی غزل خواں ہے

نغمے پابند ہو سکے نہ ادیب
کیا ہوا تو جو پابہ جولاں ہے

(ڈسٹرکٹ جیل سکندرآباد) ۱۹۵۲ء

جب تلک دار و رسن سے نہ شناسائی ہو
کوئی اُس قامت و گیسو کا نہ سودائی ہو

ایک نوخیز خلش، ایک نوآغاز طلب
جانے کس کوچہ و بازار میں رسوائی ہو

سوئے محفل کوئی آتا ہے تمنّا بن کر
جو نہ ہو اہلِ نظر وہ نہ تماشائی ہو

مسکراتے ہوئے آنسو بھی نکل آتے ہیں
دیکھ اے ضبط کہیں آنکھ نہ بھر آئی ہو

آج وہ ہند کا شہری نہیں کہلا سکتا
جس نے ایک بار نہ زنداں کی ہوا کھائی ہو

(ڈسٹرکٹ جیل سکندرآباد) ۱۹۵۲ء

شہرۂ کاکل و رخسار وہی ہے کہ جو تھا
دل حریفِ نگہِ یار وہی ہے کہ جو تھا

شہ نشینوں سے ہوس جھانکتی بیٹھی ہے ابھی
عشق رسوا سرِ بازار وہی ہے کہ جو تھا

روز اک دامنِ نو کوئی کہاں سے لائے
شیوۂ دیدۂ خونبار وہی ہے کہ جو تھا

کوئی بتلاؤ کہ ایمان کسے کہتے ہیں
نعرۂ کفر سرِ دار وہی ہے کہ جو تھا

زندگانی تری مانند حسیں ہے کہ جو تھی
زندگانی سے مجھے پیار وہی ہے کہ جو تھا

۱۹۵۲ء

ہم تجھ سے محبت کر کے بھی اے دوست محبت کر نہ سکے
جینے کے لیے تو جیتے ہیں پر تیرے لیے بھی مر نہ سکے

کیا کس کو ملا، کیا کس نے دیا یہ بات کسی سے کیا کہیے
دنیا نے یہی دیکھا ہوگا، داماں ہی ہم بھر نہ سکے

جو کچھ بھی پڑی ہم جھیل گئے کیا اُن کی جفا کیا اُن کا کرم
آغازِ وفا کی ڈھارس پر انجامِ وفا سے ڈر نہ سکے

وہ پیرِ مغاں کی فیاضی وہ مے کی فراوانی توبہ — !
میخانہ خالی ہو بھی گیا ہم جام بھی اپنا بھر نہ سکے

کیا زنجیریں کیا دار و رسن سو بار ادھر سے گزرے ہیں
ہم مر مر کے جیتے ہی رہے مارے بھی گئے تو مر نہ سکے

۱۹۵۳ء

آنکھوں پر الزام بہت ہیں
طور بہت ہیں بام بہت ہیں

کس کس در سے بچ نکلو گے
کوچہ کوچہ دام بہت ہیں

اپنی خوشی سے سب کی خوشی تک
عشق میں تیرے کام بہت ہیں

لب پر آہیں سینے خالی
ایسے عاشق عام بہت ہیں

غنچہ، شبنم، جام، انگارہ
دل کے اور بھی نام بہت ہیں

تشنہ لبی قسمت تو نہیں ہے
میخانے میں جام بہت ہیں

پینا ویسے جرم نہیں ہے
لیکن ہم بدنام بہت ہیں

۱۹۵۳ء

دزدیدہ اک نگاہ کی خواہش ضرور ہے
کم کم سہی گناہ کی خواہش ضرور ہے

تیری خوشی سے نبھ نہ سکی اِس کا غم نہ کر
غم سے ترے نباہ کی خواہش ضرور ہے

انجامِ رسم و راہ اگرچہ ہے سامنے
پھر تجھ سے رسم و راہ کی خواہش ضرور ہے

پیہم نوازشیں بھی محبت نہیں مگر
الطافِ گاہ گاہ کی خواہش ضرور ہے

پہلے زمیں کے حسن سے جی چھک تو لے ادیب
پھر دید مہر و ماہ کی خواہش ضرور ہے

۱۹۵۳ء

خیال و خواب کی دنیا میں کس کی جستجو ہوتی
نہ ہوتے جب رخ و گیسو تو کس کی آرزو ہوتی

ترے قدموں نے رکھ لی لاج ورنہ اپنی پیشانی
حرم یا دیر کے عنواں سے رسوا کُو بکُو ہوتی

تری زلفیں سلامت ایسے ابر آلود موسم میں
نہ ہوتا کچھ نہ ہوتا اک شرابِ مشکبو ہوتی

صلے میں گر مجھے دار و رسن ملتے ہیں ملنے دو
نہ گاتا میں جو حق کے گیت تو بے حِس گلو ہوتی

نہ ہوتی پرچمِ گلنار سے اُس کو اگر نسبت
اریبِ زار کی دنیا میں پھر کیا آبرو ہوتی

۱۹۵۳ء

میں تیرے غم سے غمِ روزگار تک پہنچا
تری گلی سے چلا اور دار تک پہنچا

خزاں کے جور و ستم پر نہ بات ختم ہوئی
چمن کا تذکرہ آخر بہار تک پہنچا

ہوئی نہ پھر کسی منزل کی جستجو اس کو
کسی طرح جو تری رہگزار تک پہنچا

وہ ہاتھ آج گریباں سے اپنے الجھا ہے
جو ہاتھ اٹھ کے نہ دامانِ یار تک پہنچا

ترے کنار کی ہم آرزو بھی کیا کرتے
گھٹا بھی ہجر تو کب انتظار تک پہنچا

غضب تو یہ ہے کہ تجھ کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی
ہوس کا سلسلہ کب تیرے پیار تک پہنچا

پتہ نہیں ابھی رندوں پہ کون وقت پڑے
کہ اب تو پینا ہمارا ادھار تک پہنچا

۱۹۵۳ء

کتنے بندھن ٹوٹ گئے ہیں تیرا بندھن کیا ٹوٹا
سوچ رہا ہوں جاؤں کہاں اب تیرا کوچہ جب چھوٹا

تو نے جب تک چاہا مجھ کو کانٹا کانٹا گلشن تھا
تیری نظریں جب سے بدلیں چبھتا ہے بوٹا بوٹا

میرا دامن دیکھنے والے تیرا دامن کیوں دیکھیں
حسن ہمیشہ کا سچا ہے عشق ہمیشہ کا جھوٹا

کیسے یقیں آئے گا کسی کو بات یقیں کرنے کی نہیں
سائل کو دینے کے بہانے دستِ کرم نے خود لوٹا

۱۹۵۴ء

کبھی بہ پاسِ صداقت بھی منہ نہیں کھلتا
بہت عجیب ہے یہ داستانِ جرم و سزا

نہ ہو سکا جو مداوائے زخم لالہ و گل
بچا کے آنکھ چمن سے گزر گئی ہے صبا

بہار اور خزاں مل کے ڈھونڈتے ہیں اُسے
جو پھول تیری قبا تیری سیج تک پہنچا

ہمارے دم سے ہے قائم روایتِ مستی
جو ہم نہ جائیں سوئے میکدہ اٹھے نہ گھٹا

گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

ہر ایک دوست نے دامن جب اپنا کھینچ لیا
ادیب رو نہ سکا پھر ادیب رو نہ سکا

۱۹۵۵ء

تیری قربت تیری دوری عالم عالم دنیا دنیا
تجھ سے مل کر دل کی حالت محفل محفل تنہا تنہا

جانے کس کی بات بنے گی جانے کتنی بات بڑھے گی
تیرا پہلو ایک گلستاں میری وحشت صحرا صحرا

تیرے غم سے پھوٹ بہے ہیں جانے کتنے غم دنیا کے
تیرا دامن سر آنکھوں پر میرے آنسو دریا دریا

تم نے کتنے عشق کیے ہیں عشق کی یہ توہین نہیں ہے
کو مکتی سے مے خواری تک عشق ہمیشہ رسوا رسوا

ظلمت ظلمت چیخنے والو۔ جھلمل جھلمل تارے دیکھو
صبحِ فردا روشن روشن، پنہاں پنہاں پیدا پیدا

۱۹۵۵ء

ڈالی ڈالی جن کی نگاہِ لطف سے غنچے پھوٹے ہیں
ان ہی بہاروں کے ہاتھوں نے میرے گلشن لوٹے ہیں

رگ رگ میں اب چاندنی جیسے پھیل گئی ہے کیا کہئیے
جب اُس نے دیکھا ہے مجھ کو دل میں ستارے ٹوٹے ہیں

ہر اپنا اب غیر ہوا ہے ایک تری بے مہری سے
جیسے دنیا چھوٹ گئی ہے ہم کیا تجھ سے چھوٹے ہیں

میں نے اپنے آنسو پونچھے لیکن محفل جھوم اٹھی
میرے دل کے ساز سے اکثر ایسے نغمے پھوٹے ہیں

یوں کہنے کو سب سچّے ہیں یوں کہنے کو سب جھوٹے
لیکن اپنے عشق کے قصّے کچھ سچّے کچھ جھوٹے ہیں

۱۹۵۵ء

زندگی تیری محبت ہی اگر ہو جاتی
زندگی پھر کسی عنواں سے بسر ہو جاتی

تیرے آنے سے کہاں وقت رکا شب ٹھہری
تو نہ آتا بھی تو اس شب کی سحر ہو جاتی

ہائے وہ ایک نظر جو مری جانب نہ اٹھی
دل سے ہوتی ہوئی پیوستِ جگر ہو جاتی

تو نے چاہا نہیں اے کفر و گر نہ میں کیا
تو جدھر دیکھتا دنیا ہی اُدھر ہو جاتی

مٹ گئے جس کے لیے نام تک اُس کا نہ لیا
کاش اِس بات کی اُس کو بھی خبر ہو جاتی

۱۹۵۶ء

پوچھ مت دیکھ کہ کیا حال اریب آج بھی ہے
اپنے ہی شہر میں بے چارہ غریب آج بھی ہے

تھی تو مرہم کی ضرورت پہ تری یاد کے ساتھ
ایک نشتر سا مرے دل کے قریب آج بھی ہے

دوست پھر دوست ہے اب اُس سے شکایت کیا ہو
خود مرا بختِ سیہ میرا رقیب آج بھی ہے

ابنِ آدم سے یہ دنیا ابھی مایوس نہیں — !
ابنِ مریم کے لیے گرچہ صلیب آج بھی ہے

لاکھ یورش ہو خزاں کی مجھے اِس کا ہے پتہ
ہر گلِ تازہ بہاروں کا نقیب آج بھی ہے

شکل واعظ کی بنا کر ہی نہ کیوں آئے مگر ـــ!
رندِ بدنام سلیمان اریبؔ آج بھی ہے

۱۹۵۶ء

وہی میں ہوں وہی رسوائی چاکِ گریباں ہے
وہی تیری تغافل کیشی و پاکئ داماں ہے

وہی میں ہوں وہی دل ہے وہی سر اور وہی سودا
وہی کوئے ملامت ہے وہی شہرِ نگاراں ہے

میں حیراں ہوں سیاست کیا ہے تیرے زلف و عارض کی
اندھیرا بڑھ رہا ہے پھر بھی دل میں اک چراغاں ہے

کوئی کہہ دے بس اتنا تیرے کوچہ کی ہواؤں سے
کہ یہ خاکسترِ دل آج بھی آتش بداماں ہے

جنابِ قیس سے مجھ خستہ جاں تک ہی اگر دیکھو
نہ مرنا اتنا آساں ہے نہ جینا اتنا آساں ہے

یہ بزمِ آخرِ شب ہی سہی لیکن یہاں اب بھی
وہی پریوں کا جمگھٹ ہے وہی شانِ سلیماں ہے

۱۹۵۷ء

کہیں نہ زیست پہ چھا جائیں دل کے ویرانے
بنامِ حُسن و محبت اٹھاؤ پیمانے

غمِ حیات کو صیقل ذرا کریں آؤ!
رہِ حیات میں جب آ گئے ہیں میخانے

زمانہ برسرِ پیکار اُن سے ہے اب تک
الجھ پڑے تھے کبھی زندگی سے دیوانے

خزاں کے ہو رہے دامن جب اُس نے تھام لیا
تلاشِ سایۂ گل میں چلے تھے دیوانے

نہیں کہ اُن میں جھلک ہی نہیں حقیقت کی
ہمارے نام سے مشہور ہیں جو افسانے

دیارِ صُبح میں پھرتا ہوں اجنبی بن کر
وہ میری رات کہاں رہ گئی خدا جانے

۱۹۵۷ء

مے کی جتنی عظمت ہے اُس سے کم سمجھتے ہیں
جامِ مے کو دیوانے جامِ جم سمجھتے ہیں

زندگی کی راہوں میں گو بھٹک گئے لیکن
تیری زلف کے سارے پیچ و خم سمجھتے ہیں

اپنے غم کا افسانہ میں سُنا کے پچھتایا!
میرے غم کو اہلِ دل اپنا غم سمجھتے ہیں

دوستی کے پردے میں دشمنی بھی دیکھی ہے
کون کتنا مخلص ہے یہ بھی ہم سمجھتے ہیں

بات اپنے مطلب کی جب کوئی نہیں کرتا
تم بھی کم سمجھتے ہو ہم بھی کم سمجھتے ہیں

ایک بار کی شہرت ساری عمر چلتی ہے
میں پیوں جو پانی بھی لوگ رم سمجھتے ہیں

۱۹۵۷ء

دُنیا نہ کائنات کا مارا ہُوا ہوں میں
اک حسنِ بے ثبات کا مارا ہوا ہوں میں

جس نے ہر ایک دوست کو دشمن بنا دیا
اُس چشمِ التفات کا مارا ہوا ہوں میں

جن گیسوؤں کی رات میں پائی تھی زندگی
اُن گیسوؤں کی رات کا مارا ہوا ہوں میں

دشنامِ دہر سے تو نہ کچھ ہو سکا مگر
تیرے دہن کی بات کا مارا ہوا ہوں میں

کون و مکاں کی وسعتیں زنجیر بن گئیں
حدِّ تعینات کا مارا ہوا ہوں میں

ہوں گے غمِ حیات کے مارے ہوئے تو سب
کس سے کہوں حیات کا مارا ہوا ہوں میں

۱۹۵۸ء

رباعیات

پیتے ہیں تو پینے دے چہک لینے دے
کیا ہرج ہے کچھ دیر بہک لینے دے
اِس حبس میں اس گھُٹے ہوئے عالم میں
پُروا کی طرح ہم کو لہک لینے دے

حُسنِ گل و گلزار نکھارو یارو!
زلفِ شبِ سرشار سنوارو یارو
پیمانہ بکف دست بہ دل نغمہ بہ لب
یوں ساعتِ دیدار گذارو یارو

بے رنگئ اوقات ابھی باقی ہے
بے مہرئ حالات ابھی باقی ہے
اے ماہ نہ جا چھوڑ کے ایسے ہیں مجھے
میخانے میں کچھ رات ابھی باقی ہے

٭

بے دامن و با دیدۂ تر زندہ ہوں
آئینہ بکف خاک بسر زندہ ہوں
مجھ رندِ خرابات کو دیکھو اے دُنیا
ہر سانس پہ مرتا ہوں مگر زندہ ہوں

٭

اک لطف بھی ہے غم کے سوا جینے میں
تلخی سہی مستی بھی تو ہے پینے میں
میں طالبِ فردوس نہیں اے زاہد
صد شکر کہ دوزخ ہے مرے سینے میں

ہر غم کو مرے نام سے منسوب کرو
اب اور نہ انسان کو محجوب کرو
زندہ ہے اگر ظلم تو خاکم بدہن
عیسیٰ نہیں لیکن مجھے مصلوب کرو

۱۹۵۹ء

میرے زیرِ نگیں

رہِ حیات کی سختی نہ جھیل سکتا میں
جو تیرے ہاتھ کی نرمی نہ مل گئی ہوتی
نہ جانے کب یہ دلِ زار سرد پڑ جاتا
جو تیرے قرب کی گرمی نہ مل گئی ہوتی

جو تیرا ہاتھ مرے ہاتھ میں رہے یوں ہی
تو میرے ساتھ زمانہ ہے کامرانی ہے
جو تیرا قرب مرے ہاتھ میں قلم دے دے
تو میرے زیرِ نگیں شعرِ جاودانی ہے

۱۹۶۰ء

ستارے ڈوب چکے ماہتاب باقی ہے
مرے گلاس میں تھوڑی شراب باقی ہے

گلوں پہ رنگ بہاروں میں دلکشی ہے وہی
ترا جمال سلامت شباب باقی ہے

میں تیری زلف کی آیت سے جب گزرنے لگا
کہا یہ رخ نے کہ پوری کتاب باقی ہے

ترے ستم سے تو عہدہ برآ ہوے نہ ابھی
ابھی ترا کرمِ بے حساب باقی ہے

•

میں جی رہا تھا کہ اک انقلاب آپہنچا
میں جی رہا ہوں کہ اک انقلاب باقی ہے

میں کھو گیا بھی تو کیا تیرگیٔ شب میں اریبؔ
مرا حسینؑ، مرا آفتاب باقی ہے

۱۹۶۰ء — ابنِ اریب

غم کدے وہ جو ترے گام سے جل اٹھتے ہیں
بت کدے وہ جو مرے نام سے جل اٹھتے ہیں

رات تاریک سہی میری طرف تو دیکھو
کتنے مہتاب ابھی جام سے جل اٹھتے ہیں

رات کے درد کو کچھ اور بڑھانے کے لیے
ہم سے کچھ سوختہ جاں شام سے جل اٹھتے ہیں

وہ چمن بھی نہ ہوے وجہِ نشاطِ غمِ دل
جو چمن عارضِ گلفام سے جل اٹھتے ہیں

میں اگر دوست نہیں سب کا تو دشمن بھی نہیں
پھر بھی کیوں لوگ مرے نام سے جل اٹھتے ہیں

ذہنِ شاعر میں وہ انوارِ سحر کا عالم
شعر جب شبنمِ الہام سے جل اٹھتے ہیں

۱۹۶۰ء

رنگِ عارض ترا کچھ اور نکھر آیا تھا
جب مرا غم ترے چہرے پہ اُبھر[لے] آیا تھا

ایک لمحے کے لیے تو جو نظر آیا تھا
چاند جیسے مری آنکھوں میں اُتر آیا تھا

حادثہ یہ ہے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تو نے
حادثہ یہ نہیں تو مجھ کو نظر آیا تھا

یہ بھی اس دورِ ہوس میں ہے مری جان بہت
رات کا بھولا اگر صُبح کو گھر آیا تھا

لے میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔ ادیب

میں نے پھولوں سے صلیبوں سے محبّت کی ہے
عشق میں تیرے یہ الزام بھی سر آیا تھا

تیری محفل میں سبھی صاحبِ داماں تھے مگر
میں ہی تیرے لیے بادیدۂ تر آیا تھا

۱۹۶۰ء

ناتمام غزلیں

کہاں تک خون ٹپکے گا دلِ محزوں سے دیکھیں گے؟
نگاہِ ناز میں نرمی بڑی مشکل سے آتی ہے
تہ گرداب پہنچا جب ترا وابستۂ الفت
ہوائے دامنِ یادِ کرم ساحل سے آتی ہے
بیاباں سے چلا ہوں شہر کی جانب نہ پوچھو کیوں؟
کہ اک خوشبوئے آوارہ کسی محمل سے آتی ہے

٭٭٭

تم نے کیا نہیں دیکھا جب بھی پھول کھلتے ہیں
آنچ زندگانی کی خار و خس سے آتی ہے
ہم بھٹکنے والوں کے ساتھ گو نہیں ہے تو
چاپ تیرے قدموں کی پیش و پس سے آتی ہے
سوچتا ہوں دنیا کو چھوڑ کر کہاں جاؤں؟
تیری بوئے پیراہن ہر نفس سے آتی ہے

تمھاری زلف کی نکہت سے دور ہوں لیکن
مرے خیال کی گلیوں میں پھول مہکاؤ
بہت کڑی ہے زمانے کی دھوپ ستالوں
تم اپنی زلف کے سائے کو اور پھیلاؤ

تمھارا نام ہی رہتا ہے اب زباں پہ مری
مجھے یہ ڈر ہے کہیں تم خدا نہ بن جاؤ
ابھی طلوعِ مہ نو میں دیر ہے شاید
بہت اُداس ہے یہ شام جام چھلکاؤ

شبِ دراز کے نوحے سے دم الجھتا ہے
سحر قریب ہے اِس وقت بھیرویں گاؤ

...

دشت پر ہول کا اندھیرا کیا
عشق میں شام کیا سویرا کیا

کبھی نہ ہو سکی تاریک رہگزارِ حیات
اگر چراغ بجھے دل جلا دیا ہم نے
جہاں کہیں بھی نظر آ گیا ہے حسن ہمیں
خدا سمجھ کے وہیں سر جھکا دیا ہم نے
کوئی رکھے نہ رکھے یاد اب یہ عالم ہے
خود اپنے آپ کو دل سے بھلا دیا ہم نے
ہمارے فیضِ سخن کا زمانہ شاہد ہے
جو کچھ نہ تھے انھیں کیا کچھ بنا دیا ہم نے

٭٭٭

بہار میں بھی یہ پھول کیوں یہاں نہ مسکرا سکے
چمن چمن کی بات ہے نگر نگر کی ریت ہے
کبھی وہ آنکھ اٹھ گئی تو سو پیام دے گئی
کبھی وہ آنکھ جھک گئی تو ختم بات چیت ہے
کبھی کبھی یہ سوچ کر اداس ہو گیا ہوں میں
نہ راس آئی دشمنی، نہ کوئی اپنائیت ہے

قدم سنبھال کے جیسے گزر رہا ہو کوئی
دھمک سی آتی ہے تنہائیوں میں دل کے قریں
تعیّنات کی حد سے گزر ہی جاتا ہیں
کسی نے شانہ پکڑ کر مگر کہا کہ نہیں
بدل بھی دو جو بدلنا ہے اُس کا حالِ زبوں
وہی ہیں شام و سحر اور وہی اریبِ حزیں

•••

پھر مرا ضبط فغاں تا حدِ فریاد آیا
اے خوشا بخت کہ پھر وہ ستم ایجاد آیا
ہم ہی اک جیسے گئے ویسے ہی آئے ورنہ
جو تری بزم میں ناشاد گیا شاد آیا
کل ترے واسطے ٹھکرا دیا اک عالم کو
آج لیکن دلِ مرحوم بہت یاد آیا

بربادی مقدر ہے اپنا اب کس سے شکایت کیا کیجے!
ہم راہ میں ہوں یا گھر میں ہوں برباد کہاں برباد نہیں؟
یہ بات جدا ہے اُن میں کچھ دل کی دھڑکن بھی شامل
جو نغمے ورنہ گاتا ہوں کچھ اُن سے غرض فریاد نہیں

••

وہ دور بھی آئے گا ساقی جب بادہ کش یہ سمجھیں گے
ہر ساغر اپنا ساغر ہے ہر محفل اپنی محفل ہے
یہ بات اریبِ ناداں کو کس طرح کوئی سمجھائے مگر
کانٹوں سے بچا بھی جو دامن پھولوں سے بچانا مشکل ہے

••

ہم بھی یہ کہہ نہ سکے قیس سے اے دیوانے
ہر بگولہ جو اٹھے دشت سے محمل کیوں ہو
بعد اک عمر کے یہ بات سمجھ میں آئی
ہر دھڑکتا ہوا دل درد بھرا دل کیوں ہو

جو تیرے قرب میں پھولوں کی طرح راحتِ جاں تھے
وہی لمحے پلٹ کر آج میرے دل کو ڈستے ہیں
لبِ شیریں سے جوئے شیر کو نسبت ہے بس اتنی
وہی محبوب منزل ہے وہی پُر پیچ رستے ہیں

دلِ گداز میں غم کی شگفتگی کے لیے
نہ جانے اور مجھے کتنی بار مرنا ہے
جو کام ہو نہ سکا کوہکن سے مجنوں سے
وہ کام تیشہ و صحرا بغیر کرنا ہے

میں ایک ایسا درد ہوں جس کی دوا تو بھی نہیں
میں نے تجھے پوجا مگر میرا خدا تو بھی نہیں
سارے سہارے عشق کے ٹوٹے پڑے ہیں سامنے
اس عہدِ پُر آشوب میں اے بے وفا تو بھی نہیں

یہ تیرا جسم ہے یا چاندنی نکھرتی ہے
ترا شباب ہے یا سوجِ مئے ابھرتی ہے

٭

مرا دل دُکھا کر چلے جانے والے
تجھے راس آجائے الفت کسی کی

٭

کہاں کہاں مرے قدموں نے آبرو کھوئی
یہ بات زُہرہ جبینوں سے پوچھتے کیا ہو؟

٭

انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	گوتم بدھ (طویل نظم)	فضل الرحمن	1=00
۲-	چنگیز (ڈراما)	,,	2=00
۳-	سقراط ,,	,,	1=25
۴-	سماجی افسانیات	ڈاکٹر فاطمہ شجاعت	3=00
۵-	یادگار فرحت	ڈاکٹر غلام یزدانی	3=00
۶-	چراغ منزل (منتخب کلام)	شاہد صدیقی	2=00
۷-	زبان اور علم زبان	پروفیسر عبدالقادر سروری	7=00
۸-	تلگو ادب کی تاریخ	رامانج راؤ و زینت ساجدہ	3=00
۹-	تلگو اردو لغت	گوپال کرشنا راؤ	3=50
۱۰-	اردو تلگو لغت (زیر طبع)	ڈاکٹر راما راجو	
۱۱-	بچوں کی کتابیں (مکمل سٹ)		2=00

دفتر انجمن اردو ہال حمایت نگر اور حیدرآباد کے
ہر کتب فروش سے خریدی جا سکتی ہیں۔